مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی☆

ان کی پرکاری اور ہماری سادگی!

اس دنیا میں آ کر آنکھ کھولی تو اسلامی دنیا مغرب کی چیرہ دستیوں سے لہولہان تھی۔ یعنی خلافت اسلامیہ (عثمانی) کا تیا پانچہ مغربی قزاقوں کے ہاتھوں ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ نوعمری شروع ہوئی تو مغرب کے آپس میں ٹکرانے اور ب ہونے (جنگ عظیم دوم) کا منظر سامنے آیا۔ پھر اس کے نتیجے میں مغربی طاقتوں کی گرفت اپنے مقبوضات پر ڈھیلی پڑی تو تاریخ کا ایک نیا باب کھلنا شروع ہوا۔ مغرب کے مقبوضات چاہے اسلامی ہوں یا غیر اسلامی، ایک ایک کر کے اس کی گرفت سے آزاد ہوئے۔ اسلامی دنیا کا ایک حصہ جو کمیونسٹ روس کے پنجہء استبداد میں رہ گیا تھا، اللہ نے اس کے لیے آزادی کے اسباب غیب ہی سے پیدا کر دیے اور بیسویں صدی ختم ہونے سے پہلے ہی یہ حصہ بھی آزاد اسلامی دنیا میں شامل ہوگیا۔ مگر پتہ چلا کہ آزادی اصل میں وہ ہے جو زور بازو سے حاصل کی جائے، نہ وہ کہ جو کسی کے دیے سے یا غیبی اسباب سے مفت مل جائے۔ ہماری اس نو آزاد دنیا کی آزادی وخود مختاری کی کیا اوقات ہے؟ یہ ان دنوں امریکی خرمستیوں سے ایسی روشن ہوئی ہے کہ کسی مزید بیان کی حاجت نہیں۔ عالم اسلام کو پھر سے ایک نئی جدوجہد آزادی کا چیلنج درپیش ہے۔ اور جتنا بڑا ابتلا عالم اسلام کے لیے ہے اس کا ہم میں کے ہر فرد سے تقاضا ہے کہ اپنی اپنی حیثیت وبساط کے مطابق پوری سنجیدگی سے اس میں حصہ لے۔

امریکی خرمستیوں کے پیچھے صیہونیت کا ہاتھ ہونا بھی کوئی ڈھکی چھپی چیز اب نہیں۔ ہم عام لوگ تو اس کو کہتے ہی رہتے تھے، ہمارے ارباب حکومت البتہ تکلف برتتے تھے، سو اس طبقہ پر بھی یہ تکلف بالآخر اتنا بھاری ہو ہی گیا کہ امسال او آئی سی کی دسویں سربراہی کانفرنس (اکتوبر ۲۰۰۳ء) میں جب کہ ساری دنیا (اور خاص کر امریکی اور صیہونی) اسی طرف کو نظریں جمائے اور کان لگائے ہوئے تھی، صدر کانفرنس وزیر اعظم ملائیشیا مہاتیر محمد نے اپنی صدارتی تقریر میں اسے برطرف ہی کر دیا۔ مہاتیر نے صرف امریکہ ہی کے بارے میں نہ کہا کہ (صیہونی) یہودیوں نے اسے اپنے حق میں یرغمال بنا رکھا ہے، بلکہ دنیا (world) کا لفظ اس کی جگہ بولا۔

☆ سرپرست ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، انڈیا

(Today the jews rule the world by proxy. They get others to fight and die for them.)

اور اس بیان کی سولہ آنے سچائی سامنے آتے ذرا بھی جو دیر لگی ہو، یہودیوں کو کچھ زیادہ کرنا نہیں پڑا۔ بلکہ مہاتیر نے جس دنیا کی طرف اشارہ کیا تھا یعنی مغربی دنیا (امریکہ بشمول یورپ) یہ پوری دنیا اسی لمحہ چیخ اٹھی کہ یہ کیسی بات کہہ دی گئی! یہ قطعاً ناقابل قبول (Totally unacceptable) ہے اور ان میں سے برطانیہ نے سب سے آگے جا کر ملیشیائی سفیر کو باقاعدہ وزارت خارجہ میں طلب کر کے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اس پر کیا۔

الغرض عالم اسلام کی موجودہ آزمائشی اور ابتلائی صورت حال کا یہ وہ خاص پہلو ہے جسے کسی وقت بھی نظر انداز کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ جو طاقت دوسروں کو اپنے مقاصد وعزائم کے لیے اس انداز میں استعمال کر سکتی ہے کہ یہ اس کا آلہ کار بن کر لڑائیاں مول لیں اور جانیں دیں، اس کے لیے دنیا میں پھر اور کون سی تدبیری بات ہے جو مشکل یا اس سے بعید رہ جاتی ہو؟ صاف الفاظ میں آپ کو یہ بھی بعید یا مشکل نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ خود آپ کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔نہیں، بلکہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے بارے میں ہم تقریباً یک زبان ہیں کہ یہ واقعہ اصل میں صیہونیوں کی کارروائی تھی جسے مسلمانوں کے سر تھوپ دیا گیا۔ مگر یہ کیونکر ہوا کہ ان کا کیا ہمارے سر لگ گیا؟ یہ ایسے کہ جیسے وہ دنیا پر by proxy حکومت کر رہے ہیں، ویسے ہی ۱۱ستمبر والے جہاز بھی انھوں نے ''بائی پراکسی'' اڑائے تھے اور ان کے یہ ''پراکسی'' ہمارے نوجوان تھے۔ خود سعودی عرب کو، جہاں کے شہری یہ نوجوان بتائے گئے تھے، بالآخر ۱۵ کے بارے میں تسلیم کر لینا پڑا ہے کہ اسی کے تھے اور اس کے جو نتائج سعودی عرب کو بھگتنا پڑ رہے ہیں، وہ تھوڑے بہت ہمارے سامنے بھی اخبارات کے ذریعہ آ رہے ہیں۔ اور یہ خود سعودی عرب میں خودکش دھماکوں کا غارت گرانہ سلسلہ ادھر چلا ہے، یقین کرنا چاہیے کہ یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے تاکہ نتائج کے سلسلہ کو مطلوبہ انجام تک پہنچایا جا سکے۔ امریکہ کے خلاف بجا طور پر کھولتے ہوئے جذبات نے جس طرح عرب نوجوانوں کو دشمن سازش کے جال میں پہنچایا، ان جذبات کو عراق کے المیہ نے اور بھی جس عالم میں پہنچا دیا ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ خود سعودی حکومت کی طرف ان برہم جذبات کا رخ بھی کوئی راز نہیں ہے۔ پس سازشوں کی ماہر قوم کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں رہ جاتا کہ 'دہشت گردی' کی کارروائیاں وہ سعودی عرب کی سرزمین پر بھی خود سعودیوں ہی کے ہاتھوں کرائے۔

پر افسوس کہ ہم، خاص کر ہمارے نوجوان، اپنے غم وغصہ میں اب تک بھی نہیں سمجھ پا رہے کہ اس وقت غصہ کے حکم پر عمل کرنا دشمن کے ہاتھوں میں کھیلنا ہے، بلکہ ہمارا غصہ اور اضطراب اس وقت دشمن کا ہتھیار بن گیا ہے۔ ہمارا غصہ اور ہمارا بے حد قیمتی جذبۂ جان سپاری دشمن کے کام آ رہا ہے۔ وہ اس بہانہ سے ہمارے ہر ملک میں من مانی مداخلت کا حق حاصل کر کے اسے کھلی غلامی کا شکار، اپنی طاقت کے بل پر، بنا ڈالتا ہے۔ اپنی حکومتوں سے شکایت کتنی ہی بجا اور درست ہو (اور عراق کے خلاف ۱۹۹۱ء والی وہ امریکی کارروائی جس میں سعودی حکومت کی ہر حد سے گزری معاونت اور اس

کے باقیات سے وہاں کے اہل دین کی شکایت اور اشتعال کا سلسلہ شروع ہوا ہے، یہ راقم السطور اس معاونت کے ان اولین لمحات سے ناقد ہوا تھا جب شاید ہی کوئی دوسری تنقیدی آواز سعودیہ میں یا اس باہر بلند ہوئی ہو، اور تنقید روز نامہ جنگ لندن کے ریکارڈ پر ان تائیدی بیانوں کے پہلو بہ پہلو موجود ہے جو بڑے بڑے اشتہارات کی شکل میں چھپ رہے تھے) لیکن یہ وقت کہ جب سعودیہ کے وجود کو انھی طاقتوں نے نشانہ پر رکھا ہوا ہے جن کے خلاف ہمارے سینوں میں طوفان موجزن ہے، یہ وقت سعودیہ کے ساتھ کھڑے ہونے کا ہے نہ کہ اس کے خلاف کارروائی کے لیے اس کو اچھا موقع سمجھنے کا۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے خونی ڈرامہ کا نشانہ عام طور پر افغانستان اور عراق کو سمجھا گیا ہے۔ مگر اس ڈرامہ کا خود اپنا کوئی پہلو اگر ایسا ہے جو کسی نشانہ کی نشاندہی کرتا ہو تو صرف ایک پہلو ہے جو بالکل صاف سعودی عرب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اور یہ ہے اس ڈرامہ کے مبینہ ۱۹ ہوابازوں میں سے کم از کم پندرہ کا سعودی ہونا، جسے مان لینے پر سعودی حکومت بالآخر مجبور ہوگئی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ محض اتفاق ہوسکتا ہے؟ کیا امریکہ میں بسے ہوئے عربوں میں صرف سعودیوں ہی کو ہوابازی کا شوق لاحق ہوا تھا، دوسرے عرب نژاد امریکی باشندوں کو اس شوق کی بالکل ہوا نہیں لگی جو ڈرامہ کے ذمہ دار شاطروں کو سعودیوں ہی پر انحصار کرنا پڑا؟ اس نکتہ پر توجہ دیں تو صاف نظر آجاتا ہے کہ جس منصوبے کے ماتحت ۱۱ستمبر کا ہولناک ڈرامہ کھیلا گیا، اس کے نشانوں میں سعودی عرب سب سے اول طے شدہ نشانہ تھا۔ اور سعودی امریکی تعلقات کی رو سے چونکہ اس کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ، جیسا افغانستان یا عراق کے ساتھ بلا کسی ثبوت کے کرڈالا گیا، نہیں کیا جاسکتا تھا، بلکہ کوئی معقول جواز پیدا کرنا لازم تھا کہ طوطا چشمی کی جاسکے۔ یہ ضرورت تھی جس کے لیے عربوں میں سے چھانٹ کر سعودی ہواباز ہی آلہ کار بنائے گئے۔ اور ادھر واقعہ ہوا اور دوسرے دن سے سعودیہ کے ساتھ امریکہ کا جو رویہ بدلا ہے، وہ ہم دیکھ رہے ہیں اور ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔

کوئی اور سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو، سعودیہ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ شاطرانِ دہر نے اسے نشانے پر لگوا دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ امریکی عفریت کے مقابلہ میں اپنے بچاؤ کی کوئی طاقت اس کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے جنرل پرویز مشرف کی طرح سراپا ''حاضر جناب'' بن کر اگرچہ نہیں، پھر بھی بڑی حد تک ''تعمیل ارشاد'' کردینے کا رویہ سعودی حکمرانوں نے اپنایا ہوا ہے تاکہ جان اونے پونے ہی چھوٹ جائے اور بات جہاں جاسکتی ہے، اس کی نوبت نہ آئے۔ بے شک یہ صورت حال سعودیوں ہی کے لیے نہیں، ہر خوددار مسلمان کی خودی کو چیلنج ہے۔ مگر سوائے اس کے کہ ''تعمیل ارشاد'' کے حدود اربعہ اور سائز پر گفتگو کی جاسکے، کیا کوئی دوسرا عملی راستہ بھی ہے جو ہم میں سے کوئی سعودی ذمہ داروں کو بتا سکے؟ کاش کہ ناراض سعودی عناصر اس بات کو سمجھیں کہ وقت حکومت کے رویہ کو چیلنج کرنے کا نہیں بلکہ خارجی دباؤ کے مقابلہ میں معاونت کی پیش کش کا ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے کہ امریکہ کے سامنے حکومت کا جو جھکاؤ ہم گراں ہے وہ کچھ کم کرایا جاسکے۔ دوسری صورت میں بظاہر حالات ہم اس کے سوا کچھ نہیں کرسکیں گے کہ امریکہ کو اس انداز سے

اندر آجانے کا بہانہ فراہم کردیں جس انداز کی طلب میں نشانہ باندھنے والوں نے سعودیہ کا نشانہ باندھا تھا اور پھر (اللہ نہ کرے) ہم اپنے آپ کو موجودہ سے بھی بدتر صورت حال میں پائیں۔ ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کا ایسے ہی آزمائشی موقع کا ارشاد ہے جس پر غور کیا جانا چاہیے، جو کہ حضرت معاویہؓ کے دور میں قتل حجرؓ کے موقع پر آپ سے منقول ہوا ہے۔ فرمایا:لو لا انا لم نغیر شیئا الا صارت بنا الامور الی ماھو اشد منہ لغیرنا قتل حجر (اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے جب بھی معاملات کے کسی غلط رخ کو طاقت سے بدلنا چاہا تو نتیجہ اس سے بدتر ہی نکلا تو ہم حجر کے قتل پر ضرور کچھ کرتے!) یہ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا تھا جو اس سانحہ پر آپ سے کسی اقدام کے متوقع تھے۔

سعودی عرب کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ یہ اس عرب خطہ کی واحد مملکت ہے جس کی اور باتوں سے قطع نظر اس کا سیاسی استحکام خطہ میں ایک مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ مزید برآں، حرمین شریفین کے حوالہ سے عظمت وتقدس کا ایک یگانہ مقام اسے حاصل ہے۔ اس لیے یہ مملکت اگر (خدانخواستہ) اندرونی اور بیرونی دوطرفہ دباؤ کے نتیجہ میں عدم استحکام کا شکار اور خلفشار کی نذر ہوتی ہے تو اس کے اس سے کہیں گہرے نفسیاتی اثرات خطہ پر پڑیں گے جو اثرات عراق کی ٹوٹ پھوٹ کے نتیجہ میں دیکھ رہے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اسرائیل جس کی خاطر یہ سارا ہنگامہ بپا ہے، اس کا ایک خواب 'عظیم ترین اسرائیل' کا ہے جس کے نقشے میں مدینہ منورہ بھی آتا ہے۔ اس خواب کو اس ہنگامہ میں پورا کر لینے کا موقع اسرائیل کو ملے یا نہ ملے، خطہ کے نفسیاتی اثر کی بدولت اپنے موجودہ حدود میں اسے وہ من مانیت آسان تر بہر حال ہو جائے گی جس نے علاقہ کی زندگی پہلے ہی کچھ کم عذاب نہیں بنا رکھی ہے۔

الغرض اسلامی دنیا اور بالخصوص عربی دنیا کو مخالف حالات کے جس چیلنج کا سامنا ہے وہ ''کھاؤں کہاں کی چوٹ بچاؤں کہاں کی چوٹ'' والا ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ اس کا کوئی ایک پہلو رکھ کر ردعمل کو حرکت دینا قرین عقل ومصلحت نہیں ہوسکتا۔ مغربی دنیا جس سے ہم ایسے معاملات میں عرصہ سے زک اٹھاتے آرہے ہیں، خیال ہوتا تھا کہ وہاں اب جو لوگ ہم میں سے آبسے ہیں، انھوں نے اس دنیا کے طور طریقوں سے ان معاملات میں ضرور کچھ سبق سیکھ لیا ہوگا۔ مگر ان آزمائش کے دنوں میں بڑی مایوسی ہو رہی ہے۔ سعودی عرب جہاں کے اندرونی ردعمل کا ابھی حوالہ آیا، وہاں کے لوگوں کی بھی ایک تعداد دوسرے عرب ملک والوں کی طرح یورپ میں آبسی ہے۔ ان میں ایک گروہ ہے جو سعودیہ میں نظام کی تبدیلی چاہنے والوں سے تعلق رکھتا ہے اور لندن اس کا مرکز ہے۔ سعودیہ میں رہ کر اس مقصد کے لیے آزادانہ جدوجہد نہیں کی جاسکتی ہے۔ یورپ میں کہیں ٹھکانہ بنا کر آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک جمہوریت کے ناتے اظہار خیال کی ایسی آزادی ہے کہ اللہ کی پناہ۔ دوسرے بہت دور کی سوچنے والے یہ لوگ ہیں۔ ہر ملک کے ایسے گروہوں کو بڑے کام کی چیز سمجھتے اور ''داشتہ آید بکار'' کا معاملہ اس کے ساتھ کرتے ہیں۔ کسی ملک کی حکومت شکایت کرتی ہے کہ آپ کے زیر سایہ بیٹھ کر ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈا ہو رہا ہے تو چاہے وہ دوست ملک ہی کیوں نہ ہو، بڑی آسانی سے عذر کر دیتے ہیں کہ صاحب، ہم تو اپنے خلاف بولنے پر بھی پابندی نہیں لگا سکتے۔ بہر حال، جن دنوں ریاض

میں خودکش حملوں کی وارداتیں ہوئیں، انھی دنوں میں ایک خبر پڑھی کہ اس گروہ کی کال پر ریاض میں ایک حکومت مخالف مظاہرہ اتنے سولوگوں نے کیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ،جن سے توقع کی جانی چاہیے تھی کہ جو پرجوش لوگ اس وقت حکومت کے لیے اندرون ملک مسئلہ بنا رہے ہیں، یہ ان کو سمجھانا چاہیں گے کہ یہ وقت اس کام کا نہیں ہے، وہ تو خود بے چین ہیں کہ کسی طور پر اس میں خود بھی شرکت کر لیں۔ مغرب جو ہم پر حاوی ہے، اس میں آپ کبھی نہ دیکھیں گے کہ جب ملک کسی بیرونی طاقت کی طرف سے دباؤ میں ہو تو حزب مخالف اپنا حساب چکانے نکلے۔

مگر اپنے اس افسوس پر بعد میں خیال آیا کہ یہ تو پھر بھی وہ لوگ ہیں جنھوں نے باہر سے آ کر یہاں ڈیرہ لگایا ہے۔ اپنا حال تو یہاں رشدی کی خباثت کے بعد سے یہ ہے کہ وہ جو یہیں کی تعلیم پا رہے یا پا چکے ہیں، ان میں بھی کھیپ در کھیپ ہمارے ایسے نوجوان دستیاب ہیں کہ کفر کے خلاف جوش اور جذبہ کی بانسری بجا کر آپ انھیں کسی بھی مہم پر اسی ملک لگا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ایک جماعت ''حزب التحریر'' کے نام سے قائم ہے، جو خلافت اسلامیہ قائم کرنے کی علمبردار ہے۔ ذرا غور کیجئے، یہ سرزمین برطانیہ جہاں سے نہ صرف خلافت کی آخری یادگار (ترکی) نشانہ بنی، بلکہ سارے عالم اسلام کی ہر وقت نگرانی بھی ہے کہ کہیں کسی اور اسلامی ملک کے افق سے تو یہ سورج پھر طلوع ہونے نہیں جا رہا ہے! اور کہیں بھی ان کو شبہ ہوتا ہے تو فوراً اپنے اثرات اس امکان کی جڑ کاٹنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں پر یہ نعرہ خلافت بلند کرنے والی جماعت مختلف مسلمان ملکوں سے تعلق رکھنے والے یہیں کے پیدا نوجوانوں میں سینکڑوں کو اپنے نعرہ پر رقصاں کیے ہوئے ہے۔ اور ان کالجوں یونیورسٹیوں کے نوجوانوں کی سمجھ اتنی موٹی بات کی طرف بھی نہیں جاتی کہ جو نعرہ مغرب والوں کو ہم مسلمانوں کے اپنے ملکوں میں خطرناک دکھائی دیتا ہے، اسے اپنے ملک میں گوارا ہی نہیں کر رہے، بلکہ جیسے کہ 'پرورش' کر رہے ہوں!

اس جماعت کی طرف سے ہر طرح کا لٹریچر برسہا برس سے چھپتا اور آزادانہ تقسیم ہوتا ہے۔ جلسے جلوس ہوتے ہیں اور یہ سب محض خلافت اور اسلام کے حق میں ہی نہیں ہوتا، مغرب اور اس کی تہذیب، تاریخ اور افکار نظریات سے اظہار نفرت کو بھی اس میں بھرپور حصہ ملتا ہے۔ پر کبھی جو روک ٹوک یہاں ہوتی ہو۔ اسی جماعت سے نکلا ہوا ایک گروہ ''المہاجرون'' کہلاتا ہے۔ وہ اپنے لیڈر کے فائر برانڈ (شعلہ بار) ہونے کی وجہ سے حزب سے بھی چار قدم آگے ہے۔ اور ان سب کو پیچھے چھوڑنے والے مسجد فنسبری پارک لندن کے خود ساختہ امام ابوحمزہ مصری تو ساری دنیا میں معروف ہی ہو چکے ہیں جو 'انصار الشریعۃ' نام کی جماعت چلاتے تھے۔ وہ بھی جب تک القاعدہ کے امریکی ہوّے نے ایک نئی پالیسی برطانیہ میں جاری نہیں کرا دی، اپنی عام نصرت شریعت ہی نہیں، خاص نصرت جہاد والی آتشیں انگریزی تقریروں اور ٹی وی بیانوں مباحثوں کے باوجود روک ٹوک سے محفوظ نہیں تھے، برطانوی سوشل سیکورٹی سسٹم کے ماتحت دو سو پاؤنڈ ہفتہ کا وظیفہ بھی سرکاری فنڈ سے پا رہے تھے جو اب اس بنیاد پر بند ہوا کہ ان کو عطا کردہ برٹش نیشنلٹی سلب کر لی گئی ہے۔ اور یہ وظیفہ کی عنایات کچھ جناب ابوحمزہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھیں، ان جماعتوں کا جو شخص بھی سیکورٹی سسٹم

کے ماتحت قانوناً حقدار بنتا ہو، وہ بالکل دوسرے حقدار شہریوں کی طرح اس طرح کے وظائف اور تمام لازمی شہری سہولتوں سے فیض یاب تھا اور ہے۔

یہ تینوں جماعتیں بھی (بلکہ گروپ کہیے) جیسا کہ ان ناموں سے ظاہر ہو رہا ہے، ہیں تو سعودی گروپ کی طرح، اپنی اصل سے، عربی ہی مگران تینوں نے اپنے مبیّنہ مقصد کو کسی ملک کے ساتھ خاص نہیں کیا ہے اس لیے ان کے حلقہ میں کم وبیش ہر اسلامی ملک کی نمایندگی ہے۔ حزب التحریر اور المہاجرون کے سرگرم کارکنوں میں خاص طور سے پاکستانی اور بنگلہ دیشی نوجوان زیادہ نظر آتے ہیں۔ (وجہ شاید یہ کہ رشدی خباثت کے خلاف احتجاج دراصل برصغیر ہند، پاکستان اور بنگلہ دیش والوں ہی کے جذبات سے عبارت تھا) ان نوجوانوں سے اگر یہ باتیں کہیے جو آپ کے لیے معما ہیں تو وہ اس پر غور کرنے کو تیار نہیں ہوں گے کہ وہ سادگی میں کسی کھیل کا شکار تو نہیں ہو رہے ہیں، وہ کہیں گے یہاں کا قانون ہمیں ان باتوں کی آزادی دیتا ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ اور یہاں کی یہی مجبوری ہے جو وہ روک ٹوک نہیں کر سکتی۔ مگر وہ یہ نہیں سوچیں گے کہ یہ قوانین نہ ان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں، نہ ان کی بقا ان کے بس میں ہے۔ حتیٰ کہ اس ملک کی جو شہنشاہیت ہے، اور جس کے نام سے ہی تمام قانون سازی ہوتی اور سارا کاروبار حکومت چلتا ہے، خود اس کا یہ حال بقول حکیم مشرق ہے کہ:

شاہ ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بت　　　اس کو جب چاہیں کریں اس کے پجاری پاش پاش

یہ دراصل وہی ذہنیت ہے، جسے بیمار کہیں یا بے شعور، جس کے ہم مسلمانانِ ہندوستان اسیر ہیں۔ ہندوستان کا دستور جس دستور ساز اسمبلی نے بنایا، اس میں مسلمان آٹے میں نمک کا درجہ رکھتے تھے۔ پھر ہندو مسلم بنیاد پر ملک کی تقسیم کے نتیجہ میں کم ہی ان میں وہ رہ گئے تھے جو بقیہ ہندوستان میں برابر کا حق جتانے کی اس ماحول میں ہمت دکھا سکتے ہوں۔ ایسے دستور کا کیرکٹر سیکولر رکھا جانا، یہ ہندو ممبران کی اپنی مرضی اور پسند کا نتیجہ تھا۔ مگر ہمیں جب یہ بنی بنائی چیز ملی جس پر (Made by Hindus) لکھا ہوا نہیں تھا اور لکھا جا بھی نہیں سکتا تھا، تو ہم نے سچ مچ سمجھ لیا کہ واقعی یہاں ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں کوئی وہ عملی پالیسی اپنے لیے وضع نہیں کر سکے جو واقعی ہمیں سچ مچ برابری کی سطح کی طرف لے جا سکے۔ چنانچہ جو دن گزرتا گیا، وہ برابری کی سطح سے نیچے ہی لیتا گیا ہے اور آج ہم ایسے کھلے میدان میں خود کو کھڑا پا رہے ہیں کہ جہاں سر پہ گویا آسمان بھی نہیں۔ امریکی خرمستیوں کے مقابلہ میں مسلم اقوام کی بے بسی پر آجکل اس بات کا کافی تذکرہ ہمارے یہاں ہے کہ ہمارے اسلحہ خانوں میں تو ہتھیار بھی انھیں کے دیے ہوئے ہیں، مقابلہ ہو تو کیسے ہو۔ قانونی اور دستوری اسلحہ کا معاملہ بھی اس سے کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔ وہ اگر کسی ملک کے اندر آپ کا اپنا تیار کردہ نہیں ہے یا اس کی تیاری میں برابر کا حصہ آپ کا نہیں رہا تو اس کے اوپر بھروسہ بھی ایک دن یقیناً اسی طرح پچھتاوے کا باعث ہو کے رہے گا جیسے آج اسلحہ جنگ کا معاملہ ہمیں رلا رہا ہے۔ برطانیہ میں جس قسم کے قوانین کا بظاہر تصور نہیں تھا اور جو اب تک کی قانونی روش کی روشنی میں لاقانونیت کے ہم معنیٰ معلوم ہوتے ہیں، وہ ادھر اس تیزی سے

وجود میں آنا شروع ہوئے ہیں کہ اب نہیں کہا جاسکتا کہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا؟ اور قانون کی بات چھوڑیے، عقل عام کیوں کر معاملہ کے اس پہلو سے بے اعتنائی روا رکھ سکتی ہے کہ مغرب اگر اپنی سرزمین پر اسی خلافت اسلامیہ کے لیے جدوجہد کو نہایت ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر رہا ہے جس کا مطلب اسلامی دنیا کا ایک سیاسی پیکر میں ڈھل جانا ہے، تو یہ کیسے خالی از علت ہوسکتا ہے؟ بیشک ایسا ہو چکا ہے کہ فرعون کے محل میں موسیٰ کو پرورش ملی۔ مگر اس مدت پرورش میں ایک معصوم موسیٰ تھے، وہ موسیٰ نہیں تھے جنہوں نے فرعون کے سامنے نعرہ حق بلند کیا۔ ایک دوسرا پہلو کہ وہ بھی عقل عام کو ایک تجسس (Curiosity) پر اکساتا ہے، یہ ہے کہ القاعدہ کے ہوّے کے بعد سے ان جماعتوں کے بعض ارکان کسی نہ کسی درجہ کی گرفت میں آئے لیکن اس معاملہ میں لیڈروں پر الزام کی واضح گنجائش کے باوجود صرف ایک ابوحمزہ پر تھوڑی سی آنچ آئی ہے۔ وہ بھی اس منزل پر پہنچ کر کہ کیوبا کے Guantanamo Bay کیمپ میں جو چند برطانوی نوجوان طالبان کے ساتھ قید ہیں، ان کا سرا ابوحمزہ سے ملنے کی پے بہ پے شہادتیں آتی گئیں۔ پھر بھی ان کے خلاف ایکشن کا جو انداز ہے، اس کی نیم دلی کو، کم از کم برطانیہ میں رہنے والوں کے لیے کسی بیان کی حاجت نہیں۔ جو مسجد گزشتہ سال (۲۰۰۳) جنوری میں ان کی وجہ سے بند کی گئی، وہ اگلے ہی ہفتہ سے اس مسجد کے سامنے سڑک پر جمعہ کی نماز پڑھا رہے ہیں۔ ان کے شغل میں سڑک کے راہ عام ہونے کے حوالہ سے بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی۔ جبکہ پولیس کی نفری بھی اس موقع پر وہاں متعین کی جاتی ہے! اور مسجد جو سال بھر ہونے کو آیا، اب تک نہیں کھل رہی، اس کی اصل وجہ جناب ابوحمزہ کی یہ چھوٹ ہے۔

تو ہم اپنی معصومانہ اداؤں کو کیا کہیں؟ اور کیا حق ہمیں زمانہ یا جور فلک سے شکوہ کا ہے؟ پاکستان و بنگلہ دیش یا سعودی عرب و مصر غیرہ ہی نہیں، ہم برطانیہ و امریکہ والوں کے بیچ میں رہ کر بھی وہی رہنے کی گویا قسم کھائے ہوئے ہیں جن کی باریک چالوں کی داد ایک دیدہ ور ان الفاظ میں دے گیا ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

'جہاد' اور 'اسلامی خلافت وحکومت' کے الفاظ ہماری وہ کمزوری، ہماری سادگی اور ہمارے نامبارک احساس محرومی ومظلومی کی وجہ سے بن گئے ہیں کہ ان کی صدا لگا کر جو بھی چاہے، ہمیں لوٹ لے جاسکتا ہے۔ ہم یورپ اور امریکہ میں دن بدن اپنی بڑھتی ہوئی تعداد اور جمتی ہوئی جڑوں پر خوش تو ہوئے مگر چوکنے پن سے بے نیاز ہونے کی بنا پر اس خطرہ کا کبھی بھی شاید نہیں سوچ سکے کہ ہمہ وقت چوکنا صیہونیت کو اس میں اپنے پروٹوکولی عزائم واہداف کے لیے خطرہ نظر آئے گا اور اس لیے شاطر (Cunning) ہر وہ کام کر سکتے ہیں جس کے لیے یہاں کی فضا ناسازگار ہوجائے۔ یہ ہماری کمزوریوں سے نہایت باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے ماہرین کی ریسرچ بڑی سرگرمی سے ہمارے سلسلہ میں جاری رہتی ہے۔ اور بلا شبہ یہ جتنا ہمیں جان گئے ہیں، ہم خود بھی اپنے کو اتنا نہیں جانتے۔ اور جہاں تک ان کو جاننے کا سوال ہے تو سوائے ہوائی اور خودساختہ باتوں کے ہمارے پلّے کچھ بھی اور نہیں ہے۔ کم از کم

برطانیہ میں جو تحریک خلافت ہے، اس کے بارے میں اگر ہمارا کوئی محنتی طالب علم ریسرچ پر لگ جائے تو اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہ رہ پائے گا کہ یہ سب پودا انھی کی لگائی ہوئی ہے۔

ہمارے بارے میں یہودی اور عیسائی ریسرچ کی کیا کیفیت ہے، بہتر ہے کہ اس کی بھی دو مثالیں یہاں درج کر دی جائیں۔ گزشتہ روز دو کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دیوبند پر امریکی مصنفہ Barbara Metc کی کتاب Islamic Revival in British India; Deoband 1860-1900. جو اس نے ۱۹۷۲ء میں ہندوستان کا سفر کر کے لکھی۔ دوسری ابھی دو سال پہلے کی ایک فرنچ مصنف Gilles کی کتاب جہاد (Jihad) جو فرنچ سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ دیوبند سے اپنا پشتینی رشتہ hw ، خود پورے چار سال اس میں گزارے، مگر اس کتاب کو پڑھ کر جگر مراد آبادی مرحوم کا مصرعہ ذہن میں گھوم گیا:

غزل میں یہ وسعتیں کہاں تھیں شعور فکر و نظر سے پہلے

دیوبند اسکول کا اس قدر ہمہ گیر مطالعہ ہے کہ بیشتر جگہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خاتون کو ہر ہر پہلو کی اتنی جزئیات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ میں دیوبندی طالب علم بھی، کیسا ہی مفصل کرانا چاہوں تب بھی ان میں کی بہت سی تفصیلات سے تعرض کو ایک طول لاطائل سمجھوں گا۔ علیٰ ہذا جہاد پر فرنچ مصنف کی کتاب، جس میں عالم اسلام کے تازہ جہادی رخ (Trend) کا مطالعہ کیا گیا ہے، اس کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ خود اپنی دنیا کے بارے میں ہم جیسے کم علم بھی جو بزعم خود خاصی واقفیت رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، کس قدر نا کافی ہے۔ بڑے کتابی سائز پر ۴۰۰ صفحہ کی یہ کتاب مشرق سے مغرب تک کی اسلامی دنیا کا جہادی مطالعہ، ہر ہر بیان کے لیے حوالہ کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اور حوالے بظاہر ایسے کہ کسی استادی کا شک گزرنا مشکل۔

فرنچ مصنف کی اس کتاب کے ذکر پر یاد آیا کہ اسی میں ایک ایسا بیان ملتا ہے جسے اس مضمون کے شروع میں ظاہر کیے گئے اپنے ایک خیال کی تائید میں قرآنی الفاظ و شهد شاهد من اهلها کا مصداق کہا جا سکتا ہے۔ مصر کے شیخ عبدالرحمان عمر (حفظہ اللہ تعالیٰ) موجودہ جہادی ٹرینڈ کے معماروں میں سے ہیں اور جہاد افغانستان کے سرپرستوں میں۔ جہاد افغانستان کی بدولت امریکی سی آئی اے سے ان کا رشتہ جڑ چکا تھا۔ جب کہ اپنے ملک میں وہ حکومت کے لیے ناقابل برداشت۔ مختصراً، ۱۹۹۱ء میں وہ (سوڈان کے بعد) پناہ کی طلب میں امریکہ پہنچ گئے اور اس کے بعد کی کہانی معلوم و مشہور ہے کہ ۱۹۹۳ء میں نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر بم واردات میں ملوث ٹھیرا کر ان کا ٹھکانہ جیل کو بنا دیا گیا۔ شیخ کو ملوث کرنے کی کہانی بیان کرتے ہوئے جیلس کیپل نے کہا کہ ٹریڈ سینٹر کی واردات کا کام شیخ کے ارد گرد کے سادہ اور جذباتی لوگوں سے لیا گیا۔ مختصراً مسٹر کیپل کا کہنا ہے کہ جہاں تک ان افراد کے تعین کا سوال ہے جنھوں نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی واردات میں براہ راست حصہ لیا تو اس کے مقدمہ میں کیا گیا یہ تعین یقیناً کسی شک کی گنجائش نہیں رکھتا۔ یہ تمام کے تمام شیخ سے قربت والے اور ان کی آتش ناک اینٹی امریکہ و مغرب تقریروں سے متأثر

لوگ تھے۔لیکن امریکن جسٹس ڈیپارٹمنٹ کا یہ دعویٰ کہ اس واردات کی سازش کا دماغ خود شیخ تھے، یہ آج بھی قابل گفتگو ہے بلکہ یہی نہیں کہ ایک نابینا شخص جس نے یہ سینٹر کبھی دیکھا نہ اس کے لیے آسان کہ ذہن میں اس کی شبیہ قائم کرے، کیونکر اس کو ٹارگٹ بنانے کے لیے چن سکتا تھا، اس کے وہ ساتھی بھی جو اس میں ملوث ہوئے، نہ ذہنی طور پر امریکہ سے واقفیت کے اعتبار سے اس قابل تھے کہ ان کے ہاتھوں سے ایسی کامیاب ترین پیمانہ کی واردات بغیر بیرونی امداد کے عمل میں آنا سمجھ میں آسکے۔ چنانچہ مقدمہ کے دوران میں صفائی کے وکلا کی طرف سے اس ایک مصری مخبر کے کردار کو بھرپور نمایاں کیا گیا تھا جسے امریکن ایجنسی FBI نے شیخ کے لوگوں میں گھسا دیا تھا اور ملزمان کے ساتھ اس کی ریکارڈ شدہ گفتگو ثابت کر رہی تھی کہ اس نے ان لوگوں کو اس واردات کے لیے اچھی طرح اکسایا تھا۔(ص:۳۰۱)

پس یہ جو اوپر یقین کے ساتھ کہا گیا تھا کہ ۱۱ستمبر کی واردات جو بظاہر ہمارے ہی ہاتھوں سے ہوئی، یہ اصل میں اوروں ہی کی ''بائی پراکسی'' واردات تھی، ہم محض استعمال ہوئے اور اس لیے ہوئے کہ سعودی عرب کو بھی نشانہ میں لینا تھا تو مسٹر کیپل کا مذکورہ بیان اسی طریقہ واردات کی ایک دوسری مثال بھی ہمارے سامنے لے آیا ہے، کہ شیخ عمر کو جیل میں ڈالنا تھا، ان کے آدمی قابل مؤاخذہ کام کے لیے استعمال کر لیے گئے، اور اس سے پہلے کی جو کارروائی شیخ کے ساتھ اس منزل کی طرف لیجانے کے لیے ہوئی، وہ بھی مختصراً سن لینے کی ہے۔ کیپل نے لکھا ہے کہ ایک طرف تو شیخ پر مہربانی کا یہ عالم تھا کہ امریکہ پہنچ کر جنوری ۹۱ء میں انھوں نے درخواست دی اور اپریل ہی میں انھیں گرین کارڈ عطا ہو گیا۔ یہ اس وقت تک کی بات تھی کہ کابل ابھی روسیوں ہی کے قبضہ میں تھا۔ مگر اس کے نگاہ بدلی تو شیخ جو حج (یا عمرہ) کے لیے مکہ گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو پتہ چلا کہ وہ اپنی درخواست میں ایک جھوٹ کے مرتکب ہوئے تھے۔ وہ یہ کہ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ Bigamist (ایک سے زائد بیویوں کے شوہر) ہیں، پس اس بنیاد پر وہ گرین کارڈ سے محروم کر دیے گئے، اس پر شیخ نے سیاسی پناہ کی درخواست دی تو جیل شیخ کی پناہ ٹھیری۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

شیخ سے دلی ہمدردی ہے، مگر اس پر شرمندگی بھی بیحد ہے کہ جہاد کا شعلہ بار داعی، سرپرست و مربی اور امریکی طاغوت پناہ کا طلب گار! اس کی طوطا چشمی کے بعد بھی از سر نو طلبگار! شیخ کے حال میں ہمارے لیے عبرت ہے کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد!